اشفاق حسین ناصر ایم اے

اسلام اور عصرِ حاضر

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

انسانیت کی بقاء معاشرتی اصلاح اور سیرت کی نشوونما بحیثیت سوسائٹی جسقدر اسلام کرتا ہے، دنیا کا کوئی مذہب یا عصرِ حاضر کا کوئی فلسفہ نہیں کرسکتا۔ اس کا پیغام آج بھی اتنا ہی نیا ہے جتنا کہ صدیوں پیشتر نیا تھا اس کی آواز آج بھی اتنی ہی جدید ہے جتنی کہ اپنی ابتدا کے وقت تھی اور اس کی دعوتِ فکر آج بھی اتنی ہی عظیم اور عجیب ہے جتنی کہ پہلے تھی۔ نہ اس کا پیغام پرانا ہے اور نہ ہی اس کی دعوتِ فکر۔

کائنات کی سب سے بڑی صداقت اور زندہ قوت اسلام ہے۔ جو مسلسل چودہ (۱۴) سو سال سے ابتلا و آزمائش کے باوجود انسانی ذہن میں فکری انقلاب برپا کر رہا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کی عظمت، رفعت، فراست و حرارت اور حقیقت و صداقت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کی عظمت کا کمال دراصل اس کی الہامی تعلیمات ہیں۔ جو دل کش بھی ہیں اور حیرت انگیز بھی، جو جدید معاشی نظریات اور سیاسی اختلافات کو متاثر بھی کرتی ہیں۔ اور مجلسی اور تہذیبی زندگی میں اپنی افادیت بھی تسلیم کراتی ہیں۔ دنیا کی اکثر تحریکیں اسلام ہی سے متاثر ہیں۔ دنیا کے نظام زندگی اور معاشرتی رہن سہن پر اس کی تعلیمات برابر اثر انداز ہو رہی ہیں، روحانیت، اخلاقیات، سیاسیات اور معاشیات کی اکثر تحریکیں اسلام ہی سے کسی نہ کسی طور متاثر ہیں اسلام کا پیغام ایک روحانی اور الہامی مشن کا حامل ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام دنیاوی اور مادی مسائل کو نظر انداز کر دیتا ہے بلکہ ان کے ساتھ اس کا رابطہ اتنا گہرا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے یہ کام ایک انقلابی مذہب ہی کر سکتا ہے اور پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ ہر زمانے کے انسان کو اس کے مطابق اپنے ہمہ گیر پیغام سے ہدایات دیتا ہے۔ اس سائنسی دور میں بھی جب کہ احساسِ مروت کو کچلا جا رہا ہے، اسلام ایک طرف خلوص، ایثار اور محبت و اخوت کا درس دے رہا ہے اور دوسری طرف تسخیر کائنات کی دعوت دے رہا ہے۔ اسلام عالمگیر اخوت کا درس لے کر آیا ہے۔ جغرافیائی وطن، رنگ و نسل اور عرب و عجم کے تصور کو مٹاتا ہے۔ مراکش سے لے کر جکارتہ تک اس کا پیغام ایک ہی ہے کہ سب مسلمان بھائی بھائی

ہیں۔کسی کو کسی پر فضیلت نہیں۔گورے اور کالے میں کوئی فرق نہیں سب ایک ہی باپ (حضرت آدمؑ) کی اولاد ہیں۔یہ ایک دوسرے کے دکھ درد اور مسرت و انبساط میں شریک ہونے کی تلقین کرتا ہے۔ اتفاق و اتحاد اور ایمان و اعتماد کے جذبوں کو توانائی بخشتا اور ابھارتا ہے اور انسانیت کو کوئی غیر نہیں ہے ،، کے جذبہ سے روشناس کراتا ہے۔

اللہ کے بندوں سے مجھے بیر نہیں ہے
یعنی اس دنیا میں کوئی غیر نہیں ہے

انسانیت کی حفاظت اور احترام آدمیت کے سب چشمے اسلام کے بے کراں سمندر سے نکلتے ہیں انسان کامل اور مافوق البشر کا عصری تصور بھی اسلام ہی کے ہاں ملتا ہے۔ابن عربی اور علامہ اقبال نے اپنے افکار و نظریات کی اساس تصور پر رکھی ہے جس کے باعث ایک مثالی معاشرہ کی تشکیل ہو سکتی ہے۔ایک ایسا معاشرہ جو امن، خوش حالی۔ترقی اور سچائی کا ضامن ہوگا۔

اسلام کے ہاں ایسی ریاست کے احیا کا تصور پایا جاتا ہے جس میں آمریت، نازی ازم، فاشزم اور ڈکٹیٹر شپ کی نفی ہوتی ہے۔اشتراکی نظام کے برعکس جمہوری قدروں کا خیال ابھرتا ہے اور ایک ایسے نظام حکومت کا احساس نمایاں ہوتا ہے جس میں ایک عام آدمی کی بھی آواز سنائی دیتی ہے۔جیسا کہ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ فاروق کا محاسبہ ایک اعرابی کرتا ہے۔اس سے بہتر جمہوریت کی شکل دنیا کے کسی خطہ ارض پر نہیں دکھائی دیتی۔بلکہ پوری کائنات میں اور انسانی تاریخ میں اس کی نظیر لانے سے نہیں ملتی۔ نہ تو افلاطونی جمہوریت اس سے بہتر ہے۔اور نہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی، نہ برطانیہ کی جمہوریت اس سے بہتر شکل میں ہے اور نہ ہی روس کی، اسلامی جمہوریت (خلافتِ راشدہ کا تیس سالہ پیریڈ اس کی عظیم صداقت ہے) میں مذہب اور سیاست دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔بلکہ ان کا تعلق روح اور جسم کا سا ہے۔بغیر مذہب کے سیاست چنگیزی ہے اور سیاست کے بغیر مذہب محض رہبانیت ہے۔تمدن اور معاشرت میں اسلام کا یہ تاریخی اور تحریکی کارنامہ پوری انسانیت کے لیے نمونہ عمل ہے۔

اسلام وہ مذہب نہیں جس کے خلاف کارل مارکس نے بغاوت کی یا مارٹن لوتھر نے اصلاحی تحریک چلائی۔ایسا مذہب یہودیت اور عیسائیت تو ہو سکتا ہے لیکن اسلام نہیں۔اسلام مذہب کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔جدید دور میں جب کہ یورپ میں الحادی فکر کا ارتقار مارکس کے تاریخی جدلی مادی فلسفہ کے روپ میں سامنے آیا ہے یورپ زدہ ذہنوں میں یہ سوال ابھر رہا ہے کہ موجودہ سائنسی دور میں مذہب کی گنجائش ہے یا نہیں؟ گو مایاں کے نزدیک مذہبی تصورات غیر سائنسی ہیں۔جیسا کہ انیسویں صدی کے عظیم فرانسیسی مفکر اگست کومٹ کا خیال ہے کہ انسانی فکر تین ادوار

میں منقسم کی جاسکتی ہے۔ مذہب اس فکر کا دور اوّلین ہے، دوسرا دور فلسفیانہ یا مابعد الطبیعاتی ہے اور تیسرا سائنسی ہے، مذہبی تصورات کو کچھ تو دوسرے دور میں فلسفہ نے ختم کیا اور رہے سہے تصورات اس تیسرے دور میں سائنسی طریق فکر کی آمد کے باعث ختم ہوگئے۔ ڈاکٹر منظور احمد اس تقسیم کو غلط قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اولاً تو تاریخ فکرِ انسانی کا ایک سرسری مطالعہ ہی اس مفروضے کی صحت کے بارے میں شکوک پیدا کر دیتا ہے۔ انسانی فکر کا تاریخی ارتقا اس طرح سے بندھے ادوار میں منقسم نہیں معلوم ہوتا۔ جسطرح کومت کا یہ اصول دکھاتا ہے۔ فکر انسانی کے ارتقار کا عمل اس طرح یک رخا نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک نہایت پیچیدہ عمل ہے۔ اس عمل میں مذہب، فلسفہ اور سائنس تاریخی اسٹیج پر یکے بعد دیگرے اس طرح نہیں آئے کہ دوسرے کے آنے سے پہلا رخصت ہو جائے۔ مذہب فلسفہ اور سائنس تینوں اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے بیک وقت ارتقار پذیر رہے ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے رہے ہیں اثر اندازی کی صورت بعض اوقات تعاون کی شکل اختیار کرتی رہی ہے اور بعض اوقات پیکار کی۔ فلسفیانہ نظاموں کے دور میں، جس کو کومت تاریخ فکرِ انسانی کا دوسرا نام دیتا ہے، فلسفے نے مذہب کے لیے عقلی بنیادوں پر دفاعی نظام تیار کیے، اس لیے نہیں کہ مذہب کی جگہ لے لیں۔ بلکہ اس لیے کہ مذہب قبول کرنے میں عقل حارج نہ ہو یعنی لوگ غلط فہمی کیوجہ سے فلسفیانہ نظاموں کو مذہب کا بدل قرار دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ فلسفہ وہی کام سرانجام دیتا ہے، جو اس سے قبل مذہب کا تھا یا مذہب نے انہی سوالوں کے جوابات فراہم کیے ہیں، جن کے جواب اس سے قبل مذہب نے دیئے تھے، یا آج کل سائنس وہی کام سرانجام دے رہی ہے جو کسی زمانے میں فلسفے نے انجام دینے کی کوشش کی، مذہب، فلسفہ اور سائنس کے متعلق یہ غلط فہمی، جسکا ایک نتیجہ کومت کا مندرجہ بالا مفروضہ ہے۔ ایک بنیادی قسم کے غلط مبحث سے پیدا ہوتی ہے جس کے دو پہلو ہیں۔ اولاً مذہب، فلسفہ اور سائنس تینوں ایک ہی قسم کے بنیادی سوالوں کے جواب میں پیدا ہوتے ہیں اور ثانیاً مذہب، فلسفہ اور سائنس تینوں ایک ہی قسم کے جواب فراہم کرتے ہیں"۔

مذہب، فلسفے اور سائنس کے ربط نے جو غلط فہمیاں پیدا کی ہیں اس سے بڑے بڑے دانشور

فلسفی اور سائیندان ٹھوکر کھا گئے ہیں۔ حالانکہ جب کائنات کے بارے میں تینوں مکتب فکر کے لوگ سوچتے ہیں تو ان کی آخری رائے ایک ہی ہوتی ہے مثلاً جب اس چیز کا ادراک کیا جاتا ہے کہ جو نظام فلکی ہم کو نظر آرہا ہے اس سے آگے بھی کچھ جہاں موجود ہیں، تو ایک مذہبی شخصیت سوچتی ہے کہ :

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

یہ طرز فکر علامہ اقبال کا ہے۔ اسی طرح ایک فلسفی کی سوچ اور ایک سائیندان کی دوربین کا مشاہدہ بھی اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ نظام فلکی لامحدود جہانوں تک پھیلا ہوا ہے۔ تو گویا تینوں مکتب فکر کے نزدیک "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں" کا احساس، تخیل، فکر اور مشاہدہ کے روپ میں موجود ہے

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری، قصۂ قدیم و جدید !!

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ :

"مذہب میں بھی ارتقار اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ فلسفے یا سائنس میں، نہ صرف مذہب بلکہ ایک فرد کی زندگی بھی جامد رہ جائے جب وہ محض ان اصولوں سے روحانیت کی معراج حاصل کرنا چاہے جن سے اس سے پہلے آنے والے صوفیا اور دیگر مذہبی راہنما کر چکے تھے تو یہ بات اس کے روحانی ارتقار کے لیے خطرناک حد تک بری ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ مذہب اپنی حدود کے اندر ارتقار پذیر رہے۔"

پروفیسر جوڈ تو یہاں تک کہہ گیا ہے کہ :

"بیسویں صدی کی فزکس نے طبعی دنیا کے بارے میں انیسویں صدی کے تصورات میں انقلاب برپا کر دیا ہے اور یہ انقلاب مذہب مصالحت اور دوست داری کی سمت میں ہے آج سائنس اور مذہب کائنات کی حقیقت کے بارے میں ایک ہی طرح کی بات کہہ رہے ہیں۔ گو اپنے نتائج تک پہنچنے کے لیے دونوں کے طریق ہائے تحقیق و مطالعہ جدا جدا ہیں۔ لیکن ہم کہہ سکتے ہیں ... ... کہ آج سائنس نے خدا کے تصور کا اثبات کر دیا ہے"

مذہب سے بغاوت کی نیوبوں اٹھائی گئی کیونکہ اب عیسائیت، بدھ مت، یہودیت، اور اسلام کی قوت ٹوٹ پھوٹ گئی ہے اور اب یہ ماضی کے مزار ہیں یا کھنڈر۔ اس لیے اب ان میں وہ دل کشی رہی ہے اور نہ عہد نو کی ضروریات کو یہ پورا کر سکتے ہیں، چنانچہ یورپ میں مذہب کے خلاف دو تحریکیں ابھریں، کارل مارکس نے مذہب کو برگ حشیش قرار دیا اور مارٹن لوتھر نے یورپ بھر کی ایک عیسائی سلطنت اور ہمہ گیر کلیسا کے

خواب پر کاری ضرب لگائی اور کلیسا کے خلاف ایک صدی کی ناراضگی کو تحریکِ اصلاح میں بدل دیا۔ الحادِ یورپ کے خلاف عملی بیداری نے پہلے ہی فکری قوتیں ابھار دی تھیں، تحریکِ اصلاح نے انھیں اور زیادہ گہرائی اور استقلال بخشا، رومی کلیسا کے خلاف تین باتوں نے اصلاحی تحریک کو جنم دیا۔

۱ - پادریوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ عبادت محض بے معنی لفظوں کے اعادے سے آگے نہ بڑھتی تھی۔

۲ - لوگوں کو ان کے گناہوں کی بخشش کے پروانے معمولی قیمت ادا کرنے پر مل جاتے تھے۔

۳ - مذہب حد سے زیادہ معین (FORMAL) بن چکا تھا۔

چنانچہ مغرب کی لادین سیاست کے علم بر داروں نے اسلام کے تہذیبی اور تمدنی آثار کے خلاف بھی تحریک کو خوب اچھالا۔ لیکن اسلام چونکہ ایک نظامِ حیات ہے اور وہ عیسائیت کی مانند بے معنی عبادات کے مجموعے کا نام نہیں، اس لیے اسلام میں کوئی لوتھر پیدا نہ ہو سکا۔

سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری!

مذہب کے خلاف دوسری بھرپور آواز کارل مارکس کی ہے۔ یورپ کی جدید تاریخ میں اس کو بہت اہمیت ہے۔ اس کے نزدیک مذہب وہ برگ حشیش ہے جو اقوام کو سلا دیتا ہے۔ اور مذہبی راہنما مذہب کا لبادہ اوڑھ کر اقوام کو گمراہ کرتے ہیں، جس طرح ڈارون نے معاشی دنیا میں ارتقائی قانون (THEORY OF EVOLUTION) پیش کیا۔ اسی طرح کارل مارکس نے اپنے فلسفہ کی بنیاد طبقاتی کش مکش پر رکھی اور تاریخ کی سیاسی اقتصادی تعبیر سے قانون ارتقا پیش کیا۔۔۔

اشتراکیت بہ حیثیت ایک نظریۂ حیات اور ایک تحریک رونما ہوئی اور اس کی کامیابی کا بڑا سبب یہی ہے کہ:

(i) یہ مادہ اور روح کی تقسیم پر مبنی ہے۔

(ii) طبقاتی کش مکش کا نظریہ پیش کرتی ہے۔

(iii) انسان کی تمام تر جدوجہد کو معاشیات کے گرد گھماتی ہے۔

(iv) ایک نظامِ حیات کی صورت میں ابھرتی ہے۔

(v) سوسائٹی کے انداز کو بدلنے کی کوشش کرتی ہے اور سرمایہ داری کو نیست و نابود کرنے کی سعی، بلکہ اس نے اس نوعیت کے معاشروں کے لیے انتظامیہ بھی بدل کر رکھ دی ہے۔ جس کے نتیجے کے طور پر روس میں زبردست انقلاب رونما ہو گیا اور ریلوکیت کا خاتمہ ہو گیا۔

اشتراکیت کا آخری پہلو افادیت ضرور رکھتا ہے۔ لیکن مذہب کے بارے میں اس کے نظریات باطل ہیں

اور روحانیت کے خلاف اس کی بغاوت انسانیت کے خلاف مہلک ہے۔ لیکن بہ قول اقبال:

"اسلام وحدت انسانی کو روح اور مادہ کے دو الگ الگ شعبوں میں تقسیم نہیں کرتا، اسلام میں خدا اور کائنات، روح اور مادہ اور مذہب اور ریاست میں ناخن اور گوشت کا سا باہمی تعلق ہے ..... یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں بلکہ یہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار روسو سے بھی کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا، جو عقد اجتماعی کا پابند تھا۔ ریاست اسلامی کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان شجر و حجر کی مانند خاص زمین سے وابستہ نہیں بلکہ ایک روحانی ہستی ہے جو بطور انسان ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ دار اور اس کے ایک زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کی مالک ہے۔"

مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ بطور مذہب کوئی مذہب اسلام کا مقابلہ نہیں کرسکا۔ البتہ فلسفے کے روپ میں اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اسے بھی چنداں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ آج کا انسان اضطرار و اضطراب کی کیفیت میں ہے۔ بسا اوقات وہ مایوس ہو جاتا ہے۔ علوم و فنون میں اس نے بے پناہ علم اور شعور کی دولت سمیٹ لی ہے۔ تاہم اسے سکونِ قلب میسر نہیں۔ جیسا کہ اطالوی مفکر کروشے (CROCE) نے بھی کہا ہے کہ:

"انسانیت پر کئی بار یاسیت کی پرچھائیں پڑیں اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ تاریخ انسانی میں متعدد دار ایسے آئے جب انسان شک اور مایوسی کا شکار ہوا۔ مگر دور جدید میں یہ سائے بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ فلاسفر یا وہ لوگ جن کی نگاہیں دور رس ہوتی ہیں، فلسفیانہ اور تاریخی حقائق پر پیشگوئی کر رہے ہیں کہ انسانیت کا قافلہ نہایت ہی خطرناک اور مہیب غاروں کی طرف جا رہا ہے۔"

انسان نے چاند کی غاروں، زمین کی گہرائیوں اور سیاروں کی گیرائیوں کو اپنے قدموں کی دھول بنا دیا ہے، تند اور تیز طوفانوں کا رخ موڑ دیا ہے، زلزلوں کی آمد کو پا لیا ہے، وادی کہکشاں سے گھوم پھر کر لوٹ آیا ہے، لیکن جب وہ دانش کدوں اور علمی درسگاہوں سے اٹھتا ہے تو نمناک اٹھتا ہے محبت، زندگی معرفت اور نگاہ سے یکسر تہی دامن!

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک
نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

انسان اس قدر مہذب ہوتے اور علم و شعور کی بے پناہ دولت رکھنے کے باوجود اگر سکونِ قلب کی دولت سے محروم رہے تو اس کا ماتم جتنا بھی کیا جائے کم ہے اور اس کا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں،، آج کا انسان (بقیہ برصفحہ آخر)